

## دین کا صحیح تصور

[یہ ”میزان“ کا ایک باب ہے۔ نئی طباعت کے لیے مصنف نے اس میں بعض اہم ترامیم کی ہیں۔ یہ پورا باب ان ترامیم کے ساتھ ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔]

دین کی حقیقت اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو قرآن کی اصطلاح میں وہ اللہ کی ”عبادت“ ہے۔ عالم کا پروردگار اس دنیا میں اپنے بندوں سے اصلاً جو کچھ چاہتا ہے، وہ یہی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. ”اور جنوں اور انسانوں کو میں نے صرف اس لیے پیدا کیا (الذاریات ۵۱:۵۶) ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔“

قرآن مجید نے جگہ جگہ بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے پیغمبر انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کر دینے کے لیے بھیجے تھے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ، وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ. (النحل ۱۶:۳۶) ”اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس دعوت کے ساتھ اٹھایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“

اس ”عبادت“ کے معنی کیا ہیں؟ یہ اگر غور کیجیے تو سورہ نحل کی اسی آیت سے واضح ہیں۔ اللہ کی عبادت کے بالمقابل یہاں طاغوت سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ ”الطاغوت“ اور الشیطان، قرآن میں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں، یعنی جو خدا کے سامنے سرکشی، تمرد اور استکبار اختیار کرے۔ اس کا ضد ظاہر ہے کہ عاجزی اور پستی ہی ہے۔ چنانچہ ”عبادت“ کے معنی ائمہ لغت بالعموم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ: أصل العبودية الخضوع والتذلل، (عبادت اصل میں عاجزی اور پستی ہے)۔ یہ چیز اگر خدا کی رحمت، قدرت، ربوبیت اور حکمت کے صحیح شعور کے ساتھ پیدا ہو تو اپنے آپ کو بے انتہا محبت اور بے انتہا خوف کے ساتھ اس کے سامنے آخری حد تک جھکا دینے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خشوع، خضوع، اخبات،

لسان العرب ۱۰/۹۔

انابت، خشیت، تضرع، قنوت وغیرہ، یہ سب الفاظ قرآن میں اسی حقیقت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دراصل ایک داخلی کیفیت ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی اور اس کے نہاں خانہ وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ ذکر، شکر، تقویٰ، اخلاص، توکل، تفویض اور تسلیم و رضا — یہ سب عبد و معبود کے مابین اس تعلق کے باطنی مظاہر ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اس تعلق میں اپنے پروردگار کی یاد سے اطمینان حاصل کرتا، اس کی عنایتوں پر اس کے لیے شکر کے جذبات کو اپنے اندر ایک سیل بے پناہ کی طرح اٹتے ہوئے دیکھتا، اس کی ناراضی سے ڈرتا، اسی کا ہور ہتا، اس کے بھروسے پر جیتا، اپنا ہر معاملہ اس کے سپرد اور اپنے پورے وجود کو اس کے حوالے کر دیتا اور زندگی میں ہر قدم پر اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ انسان کے ظاہری وجود میں اس تعلق کا ظہور جن صورتوں میں ہوتا ہے، ان کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

”ہماری آیتوں پر تو بس وہی ایمان لاتے ہیں جن کا معاملہ یہ ہے کہ جب ان کے ذریعے سے انھیں یاد دہانی کی جاتی ہے تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کو خوف و طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو (السجدہ ۳۲: ۱۵-۱۶)

کچھ ہم نے انھیں بخشا ہے، اس میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔“

یہ رکوع و سجدہ، تسبیح و تمجید، دعا و مناجات اور خدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اس کی راہ میں انفاق — یہی اصل ”عبادت“ ہے۔ لیکن انسان چونکہ اس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے اپنے اس ظہور سے آگے بڑھ کر یہ عبادت انسان کے اس عملی وجود سے متعلق ہوتی اور اس طرح پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس کا باطن جس ہستی کے سامنے جھکا ہوا ہے، اس کا ظاہر بھی اس کے سامنے جھک جائے۔ اس نے اپنے آپ کو اندرونی طور پر جس کے حوالے کر دیا ہے، اس کے خارج میں بھی اس کا حکم جاری ہو جائے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کا کوئی پہلو اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہر لحاظ سے وہ اپنے پروردگار کا بندہ بن کر رہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

”ایمان والو، رکوع کرو اور سجدہ کرو، اور اپنے پروردگار کے بندے بن کر رہو، اور بھلائی کے کام کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔“

تَفْلِحُونَ. (الحج ۲۲: ۷۷)

۲ اس کی ابتدا زمانہ قدیم میں نذر اور قربانی سے ہوئی۔

اللہ اور بندے کے درمیان عبد و معبود کے اس تعلق کے لیے یہ عبادت جب مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی اساسات متعین کرتی، مراسم طے کرتی اور دنیا میں اس تعلق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے حدود و قیود مقرر کرتی ہے تو قرآن کی اصطلاح میں اسے دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی جو صورت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی وساطت سے بنی آدم پر واضح کی ہے، قرآن اسے ”الدین“ کہتا ہے اور اس کے بارے میں انھیں ہدایت کرتا ہے کہ وہ اسے بالکل درست اور اپنی زندگی میں پوری طرح برقرار رکھیں اور اس میں کوئی تفرقہ پیدا نہ کریں۔ سورہ شوریٰ میں ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا، وَ  
 الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ، وَ مَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ  
 وَ مُوسَىٰ وَ عِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا  
 تَتَفَرَّقُوا فِيهِ. (۱۳:۴۲)

”اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم  
 اس نے نوح کو دیا، اور جس کی وحی اب ہم نے تمہاری  
 طرف کی ہے اور جس کی ہدایت ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور  
 عیسیٰ کو فرمائی، اس تاکید کے ساتھ کہ (اپنی زندگی میں)  
 اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔“

اس ”عبادت“ کے لیے جو مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی اساسات خدا کے اس دین میں بیان ہوئی ہیں، انھیں قرآن  
 ’الحکمة‘ اور اس کے مراسم اور حدود و قیود کو ’الکتاب‘ سے تعبیر کرتا ہے:

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَ  
 عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ، وَ كَانَ فَضْلُ اللَّهِ  
 عَلَيْكَ عَظِيمًا. (النساء: ۴:۱۱۳)

”اور اللہ نے تم پر ’الکتاب‘ اور ’الحکمة‘ نازل  
 فرمائی اور اس طرح تمہیں وہ چیز سکھائی جس سے تم واقف  
 نہ تھے، اور اللہ کی تم پر بڑی عنایت ہے۔“

”اور اپنے اوپر اللہ کی عنایت کو یاد رکھو اور اس  
 ’الکتاب‘ اور ’الحکمة‘ کو یاد رکھو جو اس نے تم  
 پر اتاری ہے، جس کی وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے  
 ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔“

اس ”الکتاب“ کو وہ ”شریعت“ بھی کہتا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ، فَاتَّبِعْهَا  
 وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ.  
 (الجمہ ۴۵:۱۸)

”پھر ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک واضح شریعت  
 پر قائم کیا ہے۔ اس لیے تم اسی کی پیروی کرو اور ان کی  
 خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو علم نہیں رکھتے۔“

۳ یعنی ہر حال میں اس پر قائم رہو۔ اقامت دین کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، ہماری کتاب ”برہان“ میں مضمون:  
 ”تاویل کی غلطی“

”الحکمة“ ہمیشہ سے ایک ہی ہے، لیکن ”شریعت“ انسانی تمدن میں ارتقا اور تغیر کے باعث البتہ، بہت کچھ مختلف رہی ہے۔

ارشاد فرمایا ہے:

لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهَا جَا ، وَلَوْ  
شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً .  
”تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شرع و  
منہاج مقرر کیا ہے، اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی

(المائدہ ۵: ۴۸) امت بنا دیتا۔“

الہامی لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات میں زیادہ تر شریعت اور انجیل میں حکمت بیان ہوئی ہے۔ زبور اسی حکمت کی تمہید میں خداوند عالم کی تجید کا مزمور ہے اور قرآن ان دونوں کے لیے ایک جامع شہ پارہ ادب کی حیثیت سے نازل ہوا ہے۔ بقرہ و نساء کی جو آیات اوپر نقل ہوئی ہیں، ان میں قرآن سے متعلق یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ تورات و انجیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کے ساتھ قیامت میں اپنا ایک مکالمہ نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، وَالتَّوْرَةَ  
وَالْإِنْجِيلَ . (المائدہ ۵: ۱۱۰)  
”اور جب میں نے تمہیں شریعت اور حکمت، یعنی  
تورات اور انجیل کی تعلیم دی۔“

”الحکمة“ کی تعبیر جن مباحث کے لیے اختیار کی گئی ہے، وہ بنیادی طور پر دو ہیں:

ایک، ایمانیات۔

دوسرے، اخلاقیات۔

”الکتاب“ کے تحت جو مباحث بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ قانون عبادات ۲۔ قانون معاشرت ۳۔ قانون سیاست ۴۔ قانون معیشت ۵۔ قانون دعوت ۶۔ قانون جہاد۔  
۷۔ حدود و تعزیرات ۸۔ خور و نوش ۹۔ رسوم و آداب ۱۰۔ قسم اور کفارہ قسم۔

یہی سارا دین ہے۔ خدا کے جو پیغمبر اس دین کو لے کر آئے، انہیں ”نبی“ کہا جاتا ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ”نبوت“ کے ساتھ ”رسالت“ کے منصب پر بھی فائز ہوئے تھے۔ ”نبوت“ یہ ہے کہ بنی آدم میں سے کوئی شخص آسمان سے وحی پا کر لوگوں کو حق بتائے اور اس کے ماننے والوں کو قیامت میں اچھے انجام کی خوش خبری دے اور نہ ماننے والوں کو برے انجام سے خبردار کرے۔ قرآن اپنی اصطلاح میں اسے ”انذار“ اور ”بشارت“ سے تعبیر کرتا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ، فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ  
مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ . (البقرہ ۲: ۲۱۳)  
”لوگ ایک ہی امت تھے۔ (انہوں نے اختلاف  
کیا) تو اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے

ہوئے۔“

”رسالت“ یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اس کی

قوم اگر اسے جھٹلا دے تو اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اس پر قائم کر دے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ  
مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوذُنَّ فِي مِلَّتِنَا، فَأَوْحَىٰ  
إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ،  
وَلَنُسَكِّنَنَّكُمْ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ .

”اور ان کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تمہیں  
اس سرزمین سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملت میں واپس  
آؤ گے۔ تب ان کے پروردگار نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم  
ان ظالموں کو لازماً ہلاک کریں گے اور ان کے بعد تمہیں  
لازمًا اس سرزمین میں بسائیں گے۔“

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، أُولَئِكَ  
فِي الْأَذْلَىٰ. كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَ  
رُسُلِي، إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ.

”بے شک، وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت  
کر رہے ہیں، وہی ذلیل ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے  
کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول بھی۔ بے شک،  
اللہ قوی ہے، بڑا زبردست ہے۔“

(المجادلہ: ۵۸-۶۰-۶۱) (ابراہیم: ۱۳-۱۴)

رسالت کا یہی قانون ہے جس کے مطابق خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ  
الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ، وَلَوْ كَرِهَ  
الْمُشْرِكُونَ. (الصف: ۶۱)

”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق  
کے ساتھ بھیجا کہ اسے وہ (سرزمین عرب کے) تمام  
ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ یہ بات (عرب کے) ان  
مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار ہو۔“

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے

ایک قیامت صغریٰ ان کے ذریعے سے اسی دنیا میں برپا کر دیتے ہیں۔ انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے میثاق پر

قائم رہیں گے تو اس کی جزا اور اس سے انحراف کریں گے تو اس کی سزا انہیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

ان کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا ان کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے

ہوئے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ حق ان کی ذات سے اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد کسی شخص کے پاس اس سے انحراف

کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ ”شہادت علی الناس“ ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو جن کے

ذریعے سے قائم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا، شَاهِدًا عَلَيْكُمْ،  
”تمہاری طرف، (اے قریش مکہ)، ہم نے اسی طرح

كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا. ایک رسول بھیجا ہے، تم پر گواہ بنا کر، جس طرح ہم نے

(المزمل ۷۳: ۱۵) فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔“

شہادت کا یہ منصب رسولوں کے علاوہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کو بھی عطا ہوا۔ قرآن نے اسی بنا پر انہیں خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک جماعت امة و سبطاً، قرار دیا اور بتایا ہے کہ اس منصب کے لیے وہ اسی طرح منتخب کیے گئے جس طرح بنی آدم میں سے اللہ تعالیٰ بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت و رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ، ”اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس جدوجہد کا  
هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ حق ہے۔ اسی نے تم کو (اس ذمہ داری کے لیے) منتخب کیا  
مِنْ حَرَجٍ، مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ. هُوَ سَمَّكُمُ ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔  
الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ تمہارے لیے پسند فرمایا  
الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ اس لیے۔ اُس نے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا، اس سے پہلے بھی  
عَلَى النَّاسِ. (الحج ۲۲: ۷۸) اور ان (آخری بعثت کے دور) میں بھی۔ اس لیے  
(منتخب کیا ہے) کہ رسول تم پر گواہی دے اور دنیا کے باقی

لوگوں پر تم (اس دین کی) گواہی دینے والے بنو۔“

نبیوں اور رسولوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بالعموم اپنی کتابیں بھی نازل فرمائی ہیں، ان کے نزول کا مقصد قرآن مجید میں یہ بیان ہوا ہے کہ حق و باطل کے لیے یہ میزان قرار پائیں تاکہ ان کے ذریعے سے لوگ اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اس طرح حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر قائم ہو جائیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ ”اور ان (نبیوں) کے ساتھ اپنی کتاب نازل کی، قول  
النَّاسِ فِي مَا اختلفوا فِيهِ. (البقرہ ۲: ۲۱۳) فیصل کے ساتھ تاکہ لوگ جن چیزوں میں اختلاف کر  
رہے تھے، ان کے درمیان یہ ان کے بارے میں فیصلہ کر  
دے۔“

وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيُقِيمَ ”اور ان (رسولوں) کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب، یعنی  
النَّاسِ بِالْقِسْطِ. (الحمد ۵۷: ۲۵) (حق و باطل کے لیے) میزان نازل کی تاکہ (اس کے  
ذریعے سے) لوگ (حق کے معاملے میں) ٹھیک انصاف

پر قائم ہوں۔“

نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا ہے۔ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وحی والہام کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے اور خدا کی عدالت زمین سے اٹھالی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کو دین پر قائم رکھنے کے لیے ”انذار“ کی ذمہ داری اب قیامت تک اس امت کے علما ادا کریں گے۔ علما کی یہ ذمہ داری سورہ توبہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

”اور سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہ تھا کہ (اس کام کے لیے) نکل کھڑے ہوتے، لیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے تاکہ دین میں تفقہ حاصل کرتے، اور اپنی قوم کے لوگوں کو انذار کرتے، جب (علم حاصل کر لینے کے بعد) ان کی طرف لوٹتے،

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً ، فَلَوْلَا نَفَرْنَا مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ ، وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ ، لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ . (۱۲۲:۹)

اس لیے کہ وہ بچے۔“

اس دین کا نام ”اسلام“ ہے اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ بنی آدم سے وہ اس کے سوا ہرگز کوئی دوسرا دین قبول نہ کرے گا:

”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ ... اور جس نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نامرادوں میں سے ہوگا۔“

(آل عمران ۳: ۱۹، ۸۵)

”اسلام“ کا لفظ جس طرح پورے دین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح دین کے ظاہر کو بھی بعض اوقات اسی لفظ اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے اس ظاہر کے لحاظ سے یہ پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز قائم کی جائے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۴۔ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔

۵۔ بیت الحرام کاج کیا جائے۔

قرآن مجید نے جگہ جگہ ان کی تاکید فرمائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں یہ ایک ہی جگہ اس طرح

بیان ہوئے ہیں:

الإسلام، ان تشهد ان لا اله الا الله و ان  
محمداً رسول الله، و تقيم الصلوة، و  
تؤتي الزكوة، و تصوم رمضان، و تحج  
البيت. (مسلم، رقم ۱)

”اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی  
الہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے رسول ہیں  
اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے  
رکھو، اور بیت الحرام کاج کرو۔“

دین کا باطن ”ایمان“ ہے۔ اس کی جو تفصیل قرآن میں بیان ہوئی ہے، اس کی رو سے یہ بھی پانچ ہی چیزوں سے عبارت

ہے:

۱۔ اللہ پر ایمان۔

۲۔ فرشتوں پر ایمان۔

۳۔ نبیوں پر ایمان۔

۴۔ کتابوں پر ایمان۔

۵۔ روز جزا پر ایمان۔

سورہ بقرہ میں ہے:

”رسول اس چیز پر ایمان لایا جو اس کے پروردگار کی  
طرف سے اس پر اتاری گئی اور اس کے ماننے والے بھی۔  
یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی  
کتابوں اور اُس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم اُس  
کے پیغمبروں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم نے سنا اور  
اطاعت کی۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے اور (اس  
بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت میں ہم سب کو) تیری  
ہی طرف پلٹنا ہے۔“

اَمَنْ الرَّسُولُ بِمَا اُنزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ  
وَالْمُؤْمِنُونَ، كُلٌّ اَمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰئِكَتِهِ  
وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ  
رُّسُلِهِ، وَ قَالُوا: سَمِعْنَا وَ اطعنا، غُفْرَانَكَ  
رَبَّنَا، وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ. (۲: ۲۸۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ ہی کی ایک فرع \_\_\_\_\_ تقدیر کے خیر و شر \_\_\_\_\_ کو ان میں شامل کر کے انھیں

اس طرح بیان فرمایا ہے:

الایمان: ان تؤمن باللہ و ملائکتہ و کتبہ  
ورسلہ و الیوم الآخر، و تؤمن بالقدر

”ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو مانو اور اس کے فرشتوں، اس  
کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانو، اور آخرت کے دن

بھی۔“

یہ ایمان جب اپنی حقیقت کے اعتبار سے دل میں اترتا اور اس سے اپنی تصدیق حاصل کر لیتا ہے تو اپنے وجود ہی سے دو

چیزوں کا تقاضا کرتا ہے:

ایک عمل صالح۔

دوسرے تو اسی بالحق اور تو اسی بالصبر۔

ارشاد فرمایا ہے:

وَالْعَصْرِ ، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ، إِلَّا  
الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ، وَتَوَّصُوا  
بِالْحَقِّ ، وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ . (العصر ۱۰۳:۱-۳)

”زمانہ گواہی دیتا ہے کہ یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں  
گے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک  
عمل کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور حق پر

ثابت قدمی کی نصیحت کی۔“

”عمل صالح“ سے مراد ہر وہ عمل ہے جو خدا کی اس حکمت کے موافق ہو جس پر اس عالم کی تخلیق ہوئی اور جس کے مطابق

اب اس کی تدبیر امور کی جاتی ہے۔ اس کی تمام اساسات عقل و فطرت میں ثابت ہیں اور خدا کی شریعت اسی عمل کی طرف  
انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

”تو اسی بالحق“ اور ”تو اسی بالصبر“ کے معنی اپنے ماحول میں ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کے ہیں۔

یہ حق کو ماننے کا بدیہی تقاضا ہے جسے قرآن نے ”امر بالمعروف“ اور ”نہی عن المنکر“ سے بھی تعبیر کیا ہے، یعنی وہ باتیں جو عقل

و فطرت کی رو سے معروف ہیں، اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کو ان کی تلقین کی جائے اور جو منکر ہیں ان سے لوگوں کو روکا

جائے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ  
بَعْضٍ ، يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ  
الْمُنْكَرِ . (التوبہ ۹:۷۱)

”اور مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ ایک دوسرے کے  
رفیق ہیں۔ بھلائی کی نصیحت کرتے ہیں اور برائی سے  
روکتے ہیں۔“

ایمان کا یہ تقاضا ہر مسلمان کو نصیح و خیر خواہی کے جذبے سے پورا کرنا چاہیے۔ دین کی صحیح روح کے ساتھ یہ ذمہ داری اس

جذبے کے بغیر کسی حال میں پوری نہیں کی جاسکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الدين النصيحة ، لله و لرسوله ، ولائمة  
”دین خیر خواہی ہے۔ اللہ کے لیے، اس کے رسول کے

لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے، اور ان کے عوام کے لیے۔“

عام حالات میں ایمان کے تقاضے یہی ہیں، لیکن انسان کو اس کے خارج کے لحاظ سے جو حالتیں اس دنیا میں پیش آ سکتی ہیں، ان کی رعایت سے ان کے علاوہ تین اور تقاضے بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں:

ایک ہجرت،

دوسرے نصرت،

تیسرے قیام بالقسط۔

بندۂ مومن کے لیے اگر کسی جگہ اپنے پروردگار کی عبادت پر قائم رہنا جان جو کھم کا کام بن جائے؛ اسے دین کے لیے ستایا جائے، یہاں تک کہ مسلمان کی حیثیت سے کھلا رہنا ہی اس کے لیے ممکن نہ رہے تو اس کا یہ ایمان اس سے تقاضا کرتا ہے کہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسے مقام کی طرف منتقل ہو جائے جہاں وہ علانیہ اپنے دین پر عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں یہ ”ہجرت“ ہے اور اپنے آپ کو اس طرح کی صورت حال میں دیکھ کر اس سے گریز کرنے والوں کو اس نے جہنم کی وعید سنائی ہے۔ سورہ نساء میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَاهُمُ الْمَلَائِكَةَ ظَالِمِينَ انْفُسِهِمْ،  
قَالُوا: فِيْمَ كُنْتُمْ؟ قَالُوا: كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ  
فِي الْأَرْضِ. قَالُوا: أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ  
وَأَسْعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا، فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ  
جَهَنَّمُ، وَ سَاءَتْ مَصِيرًا. (۹۷:۴)

”جن لوگوں کی روحیں فرشتے اس حال میں نکالیں گے کہ (دوسروں کے ڈر سے اپنے ایمان و اسلام کو چھپا کر) وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے تھے، ان سے وہ پوچھیں گے: یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے: ہم اس ملک میں مجبور اور بے بس تھے۔ فرشتے کہیں گے: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔“

اسی طرح دین کو اپنے فروغ یا اپنی حفاظت کے لیے اگر کسی اقدام کی ضرورت پیش آ جائے تو ایمان کا تقاضا ہے کہ دامے، درمے، سخنے دین کی مدد کی جائے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے اولوالامرا اگر اس مقصد کے لیے کسی وقت جہاد و قتال کا فیصلہ کریں تو ہر بندۂ مومن اپنی جان اور اپنا مال اس طرح ان کے حوالے کر دے کہ وہ جس محاذ پر اور جس طرح چاہیں اس سے کام لیں۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ اللہ پروردگارِ عالم کی ”نصرت“ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب مدینہ میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت پیش آئی اور لوگوں سے جہاد و قتال کا مطالبہ کیا گیا تو قرآن نے ایک موقع پر اس کی دعوت

”ایمان والو، کیا میں تمہیں وہ سودا بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشنے گا؟ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ گے اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو گے۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ (اس کے بدلے میں) اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ان باغوں میں داخل کر دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ عمدہ گھر عطا فرمائے گا جو اب کے نخل زاروں میں ہوں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے اور (سنو) وہ چیز بھی جس کی تم تمنا رکھتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور وہ فتح جو عنقریب ظاہر ہو جائے گی۔ اور اہل ایمان کو، (اے پیغمبر)، اس کی بشارت دو۔ ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو جس طرح کہ عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار ہے؟ حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا، هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنَجِّيْكُمْ مِّنْ عَذَابِ أَلِيمٍ؟ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ، ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ، إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ. يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَ مَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّةٍ عَدْنٍ، ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ. وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا، نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَ فَتْحٌ قَرِيبٌ، وَ بَشِيرٍ لِّلْمُؤْمِنِينَ. يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا، كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِّلْحَوَارِيِّينَ: مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ، قَالَ الْحَوَارِيُّونَ: نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ. (الصف ۶۱: ۱۰-۱۴)

سلف و خلف میں دین کی حفاظت، بقا اور تجدید و احیا کے جتنے کام بھی ہوئے ہیں، ایمان کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہوئے ہیں۔ امت کی تاریخ میں زبان و قلم، تیغ و سناں اور درہم و دینار سے دین کے لیے ہر جدوجہد کا ماخذ یہی ”نصرت“ ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ایمان کا یہ تقاضا اگر کسی وقت سامنے آجائے تو بندۂ مومن کو دنیا کی کوئی چیز بھی اس سے عزیز تر نہیں ہونی چاہیے۔ ارشاد فرمایا ہے:

”(اے پیغمبر)، ان سے کہہ دو کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان، اور تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا اور وہ تجارت جس کے مندرے سے تم ڈرتے ہو، اور تمہارے وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہیں اگر اللہ سے، اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے اور

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَ إِخْوَانُكُمْ وَ آزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيرَتُكُمْ، وَ أَمْوَالٌ أُفْتَرَفْتُمُوهَا، وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا، وَ مَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَ جِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ، فَتَرْبُّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ، وَ اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ.

(التوبہ ۹: ۲۴) (جان لو کہ) اس طرح کے بدعہدوں کو اللہ راہ یاب نہیں

کرتا۔“

پھر اس عالم میں انسان کے جذبات، تعصبات، مفادات اور خواہشیں اگر دین و دنیا کے کسی معاملے میں اسے انصاف کی راہ سے ہٹا دینا چاہیں تو یہی ایمان تقاضا کرتا ہے کہ بندہ مومن نہ صرف یہ کہ حق و انصاف پر قائم رہے، بلکہ یہ اگر گواہی کا مطالبہ کریں تو جان کی بازی لگا کر ان کا یہ مطالبہ پورا کرے۔ حق کہے، حق کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ انصاف کرے، انصاف کی شہادت دے اور اپنے عقیدہ و عمل میں حق و انصاف کے سوا کبھی کوئی چیز اختیار نہ کرے۔ یہ ”قیام بالقسط“ ہے اور قرآن مجید میں اس کا حکم اس طرح بیان ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ  
شُهَدَاءَ لِلَّهِ ، وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ  
وَالْأَقْرَبِينَ ، إِنَّ يَكُنْ عَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ  
أَوْلَىٰ بِهِمَا ، فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ،  
وَإِنْ تَلَوْا أَوْ تَعْرَضُوا ، فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا  
تَعْمَلُونَ خَبِيرًا . (النساء: ۴: ۱۳۵)

”ایمان والو، انصاف پر قائم رہنے والے بنو، اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ اس کی زد خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور تمہارے اقربا ہی پر پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کے لیے احق ہے۔ اس لیے تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر اسے بگاڑو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ  
شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ  
قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ، وَعَدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ  
لِلتَّقْوَىٰ ، وَاتَّقُوا اللَّهَ ، إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا  
تَعْمَلُونَ . (المائدہ ۵: ۸)

”ایمان والو، عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک، اللہ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔“

ایمان کا یہی تقاضا ہے جس کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے اس بات پر بیعت لیا کرتے تھے کہ: نقول بالحق اینما كنا ، لانخاف في الله لومة لائم<sup>۱</sup> (ہم جہاں ہوں گے، ہمیشہ حق کہیں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کوئی پروا نہ کریں گے)۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان  
جائر . (ابن ماجہ، رقم ۴۰۱۱)

”حق و انصاف کی بات ایک بڑا جہاد ہے، جب وہ ظالم حکمران کے سامنے کہی جائے۔“

اس دین کا جو مقصد قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح میں ”تزکیہ“ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی

انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلائشوں سے پاک کر کے اس کے فکر و عمل کو صحیح سمت میں نشوونما دی جائے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ انسان کا نصب العین بہشت بریں اور راضیۃ مرضیۃ کی بادشاہی ہے اور فوز و فلاح کے اس مقام تک پہنچنے کی ضمانت انھی لوگوں کے لیے ہے جو اس دنیا میں اپنا تزکیہ کر لیں:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى ، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ  
فَصَلَّى . بَلْ تُؤَثِّرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ،  
وَالْآخِرَةَ خَيْرًا وَأَبْقَى . (الاعلیٰ: ۸۷-۱۴-۱۷)

” (اس وقت) ، البتہ کامیاب ہو اوہ جس نے اپنا تزکیہ  
کیا اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (نہیں)،  
بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دریاں حالیکہ (آخرت  
اس کے مقابلے میں) بہتر بھی ہے اور پائندار بھی۔“

لہذا دین میں غایت اور مقصود کی حیثیت تزکیہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ کے نبی اسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے اور سارا دین اسی مقصود کو پانے اور اسی غایت تک پہنچنے میں انسان کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ ،  
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ ، وَيُزَكِّيهِمْ ، وَيُعَلِّمُهُمُ  
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ . (الجمعة: ۶۲:۲)

” وہی ذات ہے جس نے ان امیوں میں ایک رسول انھی  
میں سے اٹھایا ہے جو ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے  
اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور (اس کے لیے) انھیں شریعت  
اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

اس دین پر عمل کے لیے جو رویہ اس کے ماننے والوں کو اختیار کرنا چاہیے، وہ ”احسان“ ہے۔ احسان کے معنی کسی کام کو اس کے بہترین طریقے پر کرنے کے ہیں۔ دین میں جب کوئی عمل اس طرح کیا جائے کہ اس کی روح اور قالب، دونوں پورے توازن کے ساتھ پیش نظر ہوں، اس کا ہر جز بہ تمام و کمال ملحوظ رہے اور اس کے دوران میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور میں سمجھے تو اسے ”احسان“ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ ،  
وَ هُوَ مُحْسِنٌ ، وَ اتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا .  
(النساء: ۴:۱۲۵)

” اور اس سے بہتر دین کس شخص کا ہو سکتا ہے جو اپنے آپ  
کو اللہ کے حوالے کر دے، اس طرح کہ وہ ”احسان“ اختیار  
کرے اور ملت ابراہیم کی پیروی کرے جو بالکل یک سو تھا۔“

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبلغ اسلوب میں اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

”احسان“ یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم  
اُسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے  
تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔“

الاحسان ، ان تعبد الله كأنك تراه ، فان  
لم تكن تراه ، فانه يراك . (مسلم، رقم ۱)